میں نے اس چابی سے ایک مکمل صورت تشکیل کر لی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ ضرور ہو گا۔ یقیناً نوجوان ہو گا۔ اس رنگ کے کوٹ وہاں نوجوان ہی پہنتے ہیں۔ بوڑھوں کا تو یہ فیشن ہی نہیں ہے اور اس کے رنگ ہی سے لگتا تھا کہ نوجوان بھی تھا اور طرحدار بھی اور محبوب طبع بھی ـــــ چلتا ہو گا تو دائیں پاؤں پہ ذرا زیادہ وزن ڈالتا ہو گا۔ بچپن میں کہیں ہلکا سا پولیو کا اٹیک ہوا ہو گا۔ ذرا سا نقص ٹانگ میں رہ گیا جو اس کے حسن میں بڑھ جاذبیت پیدا کرتا ہے ـــــ لڑکیوں سے بات کرتا ہے تو بھوری آنکھیں اور بھی شربتی ہو جاتی ہیں۔ سورج اس کی پشت پر چمک رہا ہو تو کرنیں بھورے بالوں میں سے چھن چھن کر ایک سرخ سی روشنی پیدا کرتی ہیں۔

خدا جانے کیسے اور کیونکر اس چھلّے والے کے ساتھ میں نے اپنی شخصیت کو مدغم کر لیا۔ اب سونے سے پہلے چھلّے والا یعنی میں خود اپنا اوورکوٹ پہن کر نیویارک کی ایک سات منزلہ عمارت پر تیسری منزل پر لفٹ میں پہنچتا۔ لمبی گیلری میں ہوتا ہوا کمرہ نمبر ۳۳۲ کے چمکتے تالے میں چابی پھنساتا۔ دروازہ کھلنے کی آواز ہرگز نہ آتی۔ صرف ہاتھ کا دباؤ بتا دیتا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ اندر پہنچ کر میں اپنی ٹوپی اور کوٹ ہینگر پہ ٹانگتا۔ کھڑکی کے نیچے چیونٹیوں کی طرح چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا اور پھر ایک لمبی الماری میں دوسری چابی فٹ کر کے کھولتا۔ اس چابی کے لگتے ہی دیوار کا تختہ، جو بظاہر دیوار کا حصہ نظر آتا تھا، دیوار میں اندر کی طرف خاموشی سے گھس جاتا۔ الماری کے اندر ایک چھوٹے سے شیلف میں تیسری موتیا کی کلی جیسی چابی پھنسا کر میں ایک خفیہ دراز کھولتا اور ایک ننھی سی ایسی پستول نکالتا جسے چلاؤ تو رتی بھر پٹاخے کی آواز نہیں آتی۔ اس پستول کو جو غیر قانونی طور پر میری ملکیت تھا اندرونی جیب میں رکھ کر میں شیلف اور الماری بند کرتا۔ اوورکوٹ کے کالر اوپر اٹھاتا اور کمرے کو لاک کر کے باہر نکل جاتا۔

میں کبھی امریکہ نہیں گیا۔

لیکن وہ ساری امریکن فلمیں جو میں اپنی بیوی کے ساتھ اسے خوش کرنے کے لیے دیکھ چکا ہوں۔ اس وقت جب چابیوں کا چھتا میرے ہاتھ میں اور سر تکیے پر ہوتا میرے کام آتیں۔ میں ننھی پستول کو جیب میں ڈال کر جیمز بانڈ سیریز کا ہیرو بن جاتا ہوں ـــــ کبھی ہانگ کانگ میں سارنگ میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ، کبھی وادیوں میں، کاروں میں، "چیز" کرتا ہوا ـــــ کبھی روس میں بھیس بدل کر اور کبھی ٹوکیو میں جاپانیوں سے جوڈو کھیلتا ہوا ـــــ

یکدم زندگی پستول کی گولی کی طرح قابو سے نکل گئی۔ میں سارا دن رات کا انتظار کرتا رہتا جب چابیوں کو پکڑتے ہی میرے تخیل کا تالا کھل جاتا۔ اب میں فلموں سے بہت آگے سوچنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ میری پریکٹس اس قدر بڑھ گئی کہ میں بیک وقت ولن اور ہیرو کا پارٹ ادا کرنے لگا۔

کچھ تو ان تصورات کا اثر میری عملی اور دن کی زندگی پر ہونا ضرور تھا۔ اب فجر کی نماز عام طور پر قضا ہونے لگی۔ میں چوری چوری برل کریم خرید کر بالوں کی پٹیاں جمانے لگا۔ اگر مجھے اپنی بیوی کا اس قدر دھڑکا نہ ہوتا تو شاید میں بالوں کو پولی کلر سے رنگ بھی لیتا۔ بوٹ جو پہلے کئی کئی دن تک پالش نہیں ہوتے تھے اب باقاعدگی سے چمکنے لگے۔ میرا معمول تھا کہ ہر شام اپنے ننھے پوتے کے لیے تھوڑی سی میٹھی سونف خرید لایا کرتا تھا لیکن اب میں نے ذرا قیمتی قسم کے سگریٹ پینا شروع کر دیے تھے اس لیے باقی تمام اخراجات اسی کی نذر ہو جاتے تھے۔ مہینے بھر کا سودا سلف لانا میری ذمہ داری تھی۔ اب میں شروع مہینے میں اپنی بیوی کے لیے چوہس قسم کی رنگدار عینک لمبی نائیلون کی جرابیں اور خوبصورت رومال لایا تو وہ بھلی لوگ خوش ہونے کے بجائے الٹا بھڑک اٹھی:

"یہ سب آپ کیا سمجھ کر لائے ہیں؟"

"دراصل مرد کو تحفہ دینا کبھی نہیں آتا۔ وہ جوان لڑکی کو کتابیں اور بوڑھی عورت کو

لپ سٹک پیش کرتا ہے۔

"یہ ـــ میرا خیال تھا کہ تم یہ سب کچھ پسند کرو گی"۔

"یہ ـــ میرے استعمال کی چیزیں ہیں؟ بتائیے!"

"عینک لگا کر تو دیکھو، تمہیں سمجھ آئے گی"۔

"لیجیے دیکھیے ـــ ضرور دیکھیے اور اڑائیے میرا مذاق"۔

جس وقت میری بیوی نے چورس فریم والی عینک لگائی جس پہ پلاسٹک کے رنگین ستارے سے بنے تھے تو پہلی بار میں بھونچکا رہ گیا۔ اتنا پاس رہنے کے باوجود ایک بار بھی مجھے شبہ نہ ہوا تھا کہ وہ اس عمر میں نہیں ہے۔ جب ایسی چیزیں سجاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

"جائیے۔ یہ سب کچھ لوٹا کر آئیے"۔

چیزیں تو میں نے لوٹا دیں لیکن میں اُن خیالات کو دکاندار کے کاؤنٹر پر نہ چھوڑ سکا جو چاہیوں نے عطا کیے تھے۔ سردیوں کی رات میں ویسے بھی گرم لحاف بہترین دوست ہوتا ہے۔ اب جو چاہیوں نے کھلی آنکھوں خواب دیکھنے کی عادت ڈال دی تو میں سرِشام ہی چارپائی کا سہارا ڈھونڈنے لگا۔ خدا جانے یہ سلسلۂ خیالات کیا گُل کھلاتا اور اس کی تان کہاں جا کر ٹوٹتی لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ہمارے دفتر میں ریسرچ آفیسر ایک تیس سالہ نوجوان عورت ہے۔ بدقسمتی سے وہ دو عیبوں سے متصف ہے۔ ایک تو زیادہ پڑھی لکھی ہے دوسرے صورت شکل سے لنڈے کا مال معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں خاصیتیں مردوں پر عموماً بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ وہ ریسرچ آفیسر کو یکسر عورت ہی نہیں سمجھتے تھے اور اس کی موجودگی میں جنسی لطیفوں کی بھرمار کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتے تھے۔ مس آصفہ بھی غالباً مردوں کی کور ذوقی کی عادی ہو چکی تھیں اس لیے ان کا رویہ ہم سب سے کامریڈ قسم کا تھا۔ وہ فری لنچ مانگ کر خوش ہوتیں۔

ہم لوگوں سے سگریٹ لے کر پینے میں انہیں باک نہ تھا اور وقت بے وقت دفتر کے ہمکاروں کے ساتھ پکنک وغیرہ پر جاتے ہوئے بھی وہ شرماتی نہیں تھیں۔

مس آصفہ میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جن سے لوگ عشق کیا کرتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس بات سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے انھوں نے کبھی ایسی اداؤں کا اظہار نہ کیا جو عورت کو مرد کے لیے عزیز بناتی ہیں۔ یہ انھیں سردیوں کا ذکر ہے کہ مس آصفہ نے میرے گھر اور دفتر کے عین درمیان کرائے پر مکان لے لیا۔ اب وہ کبھی کبھی مجھے بس سٹاپ پر اکیلی کھڑی نظر آنے لگیں۔

سردیوں کی صبح کو بس سٹاپ پر اکیلی کھڑی عورت، بڑا دلدوز منظر ہے اور وہ بھی جب قریب سے ہیٹر لگی کاریں زوں زوں گزری جا رہی ہوں اور وہ فر لگے کوٹ کا کالر کانوں تک اٹھائے، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے، ہاتھ میں لیدر کا بڑا سا بیگ لیے بس سٹاپ کے سامنے بجلی کے کھمبے سے لگی کھڑی ہو۔

ایسے ہی کرب ناک منظر سے مرعوب ہو کر میں نے ایک دن موٹر سائیکل پر انہیں لفٹ دے دی۔ ویسے تو میری بیوی کئی مرتبہ میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھی ہے لیکن وہ اور میں اس قدر ایک ہی جسم کا حصہ ہو چکے ہیں کہ اس کے بیٹھنے سے یہی احساس ہوتا ہے جیسے میں ہی اکیلا موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں۔ مس آصفہ حیدری نے کیونکس لگی انگلیاں میرے کندھے پر رکھیں اور بہت احتیاط سے رکھیں اور نہایت لاتعلقی سے رکھیں لیکن اجنبی ہونے کی رعایت سے اپنے آپ سے پرے ہونے کے لحاظ سے، تجربے کے نئے پن کے اعتبار سے وہ مجھے اچھی سی لگیں۔

عورت کو بڑا آرام ہے — اُسے دنیا میں ایک آدمی اچھا لگتا ہے اور باقی سارے مردوں سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے۔

مرد کو عورت ذات سے پیار ہے — یہ کسی روپ میں کہیں بھی ہو اُسے اچھی لگے گی۔

اب اسی کمبختی کے پیشِ نظر مجھ سے ایک غلطی سرزد ہونے لگی۔ میں ہر روز بس سٹاپ پر

انتظار کرنے لگا اور جو کسی روز مس آصفہ حیدری بس میں جا چکی ہوتیں تو مجھے دل ہی دل میں ایک طرح کا افسوس سا ہوتا ــــ پھر رفتہ رفتہ دفتر سے واپسی پر بھی وہ میرے ساتھ آنے لگیں۔

اب یقین کیجیے کہ اس معاملے میں اس سے آگے پیچھے اور کچھ نہیں ہے ــــ ایک معمولی سی لفٹ ــــ جو ایک دن میری بیوی نے بس میں جاتے ہوئے دیکھ لی ــــ تو سمجھیے کہ گھر پر قیامت کا نزول ہوا۔

جب بیوی جوان تھی تو وہ میری اصلی نقلی اور خیالی محبوباؤں سے نہیں جلتی تھی تب اسے اپنے کس بل پر بہت مان تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جائے گا کہاں تک ــــ اور اب جبکہ اس کے جسم پر فوم ربڑ چڑھ چکا ہے، چہرے پر بالوں نے یلغار کر دی ہے۔ آواز بھاری اور بھدی ہو چکی ہے۔ اب جبکہ کوئی چیز اسے غیر شعوری طور پر سائرن بجا بجا کر بتاتی ہے کہ اس میں قوتِ مدافعت نہیں ہے۔ وہ ہر چھچھوندر صورت عورت یا لڑکی کو چار سو بیس حرافہ سمجھتی ہے ــــ خدا جانے سائیکلوجی والے کیا کہتے ہیں اور اس بڑھاپے کے حسد کے متعلق انھوں نے کیا حل نکالے ہیں لیکن میں اس قدر جانتا ہوں کہ ایسے معاملے میں مرد بے چارے پر بھڑ بھس کا الزام لگتا ہے اور یہ الزام اس کی نامردی کے الزام سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے جو جوانی میں ایک کنواری دولہن لگا سکتی ہے۔

مس حیدری سے جلنے کی تین سیٹیجیں آئیں۔

پہلے تو میری بیوی چپکے چپکے روئی اور اندر ہی اندر پتہ کرواتی رہی کہ یہ لفٹ کس کو دی جاتی ہے؟

پھر اس نے اشارۃً بے وفائی اور کج ادائی کے طعنے دینے شروع کیے۔

بعد ازاں جب مجھ پر کوئی اثر نہ پایا تو کھلم کھلا پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ مقدمہ دائر ہوا اور پرانی ساری مروت بھلا کر مجھے اپنا جانی دشمن سمجھ بیٹھیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کی کھوپڑی کیسے سوچتی ہے۔ اسے غربت میں رکھو۔ آدھی روٹی کھلاؤ، سستی کھیلتی رہے گی لیکن سونے کا نوالہ کھلاؤ اور کسی دوسری عورت کی جانب آدھی نظر بھی ڈال لو تو تختِ طاؤس کو لات مار کر سنیاس لے لے گی۔ اپنا گھر برباد کر لے گی اور مرد کی عافیت تباہ کر دے گی۔

میری بیوی کا مجھ سے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ــــ یعنی تاوقتیکہ اس کی گود میں پوتا نہیں تھا۔ پوتے کی آمد کے بعد اختلافات کچھ اس قسم کے ہوتے کہ میری بیوی بولتی رہتی اور میں سنتا اور کڑھتا رہتا۔ اسی لیے یہ اختلاف کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوئے لیکن اس بار تو جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور شگاف سا پڑ گیا ہم دونوں کے درمیان ــــ میں نے قسمیں کھائیں۔ وعدے کیے۔ حلفِ وفاداری اٹھائے لیکن شکوک تھے کہ راکٹ کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتے تھے ــــ بالآخر میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ مس حیدری سے کوئی کلام نہ رکھوں گا۔ اس سے میری بیوی کے شکوک تو رفع نہ ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے مجھ پر اور میری قسم پر اعتبار کر کے اس بات کا ذکر چھوڑ دیا۔

اب پاسِ قسم سے ایک مشکل اور درپیش ہوئی۔ میں روز مس حیدری کو لفٹ دیا کرتا تھا اور وہ سردیوں کی صبح کو میری منتظر رہا کرتی تھی۔ اب میں رستہ بدل کر دفتر جانے لگا۔ دفتر سے واپسی پر بھی میں کہیں نہ کہیں چھپ جاتا۔ میری اس بے اعتنائی نے ایک اور گل کھلایا۔ مس حیدری جو مردوں کی طرح دفتر میں زندگی بسر کر رہی تھیں یکدم عورت بن گئیں۔ انھیں میرے ساتھ دفتر میں کام کرتے پورا چوتھا سال تھا اور ان چار سالوں میں ان کی ذات سے سرکاری اور غیر سرکاری ایک بھی سکینڈل منسوب نہ ہوا تھا۔ بے چاری اپنے طرز کی نہایت بے ضرر خاتون تھیں۔ لوگوں کی شادی شدہ زندگی تباہ کرنے کا انہیں خیال بھی نہ آسکتا تھا۔ لیکن میں جوانی سے چھپنے لگا اور اپنی جان چرانے لگا تو سوئی ہوئی نیند سے شہزادی جاگی اور پہلا مرد جو اسے نظر آیا، وہ میں تھا۔

پہلے تو ایک دن میرے کمرے میں میری غیر موجودگی میں ایک نوٹ لکھ کر چھوڑ گئیں کہ میں اُن سے مل لوں لیکن جب میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہ کی تو دوسرے دن وہ میرے کمرے میں آئیں اور بڑی دیر بیٹھی رہیں لیکن میں بڑی شدت سے ٹائپ کرتا رہا اور اس دوران کئی بار اٹھ کر باس کے کمرے میں گیا۔ اس کے بعد وہ عموماً کمرے میں چھوٹی چھوٹی سرکاری الجھنیں اور سرکاری گوسپ لے کر آنے لگیں۔ میں چونکہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا چکا تھا اس لیے قطعاً اُن کی اس توجہ نے مجھ پر اثر نہ کیا۔

اُس رات میں چابیوں کے ساتھ پلنگ میں ریٹائر ہو چکا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں خیالوں میں پانچ فٹ گیارہ انچ کا خوبرو نوجوان تھا۔ میں نے پہلے لمبی چابی سے ایک طاق کھولا۔ پھر دیوار میں دوسری چابی لگا کر الماری کھول۔ اس کے بعد موتیا کی کلی ایسی چابی فٹ کر کے خفیہ دراز کھول کر وہ ننھی سی پستول نکالی اور ابھی گیلری تک پہنچا ہی تھا کہ میری بیوی ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفید لفافہ لیے آ گئی:

"اور اب بھی آپ کہیں گے کہ معاملہ کچھ نہ تھا ــــ!"

میں اپنے حواس مجتمع نہ کر سکا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ قرآن کی جھوٹی قسم بھی کھا سکتے ہیں!"

"لیکن ہوا کیا ہے آخر ــــ؟"

"اس عمر میں معصومیت کا ڈرامہ کچھ ایسا جچتا نہیں آپ پر۔"

"کچھ سمجھاؤ بھی۔"

"یہ خط تو آپ جیسے پہچانتے ہی نہیں!"

"خط ــــ؟"

"لیجیے اور دیکھیے۔ میں ایسی تنگ نظر نہیں ہوں کہ ایسی باتوں کا برا مان جاؤں۔ آپ شوق سے جہاں جگہ دل لگائیے ــــ سو جگہ خط لکھیے ــــ اور ان چابیوں کو مہینے سے لگا کر

رکھے جن میں یہ خط مقفل ہوتے ہیں لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے مجھ سے سچ نہیں کہا۔ مجھے اپنا خیر خواہ نہیں سمجھا۔ اپنا دوست نہیں جانا۔"

"کون کہتا ہے ـــــ ؟"

"جوانی میں آپ سے جو کچھ بھی ہوا میں نے معاف کیا کیونکہ آپ نے ہمیشہ مجھ سے سچ کہا اور ہر بات مجھے بتائی لیکن اب آپ مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں ـــــ رازداری برتتے ہیں مجھ سے۔"

"کون کہتا ہے ـــــ ؟"

"میں جانتی ہوں یہ کوٹ کہاں سے آیا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ چابیاں کون سے تالے کی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اُس تالے کو کھول کر کس کے خط رکھے جاتے ہیں ـــــ خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔ آپ جس سے چاہے دل لگائیے لیکن خدا کے لیے جھوٹ تو نہ بولیے مجھ سے ـــــ"

میری بیوی یوں ہی بولتی ہوئی باہر چلی گئی۔

سفید منّا سا خط میرے پلنگ پر پڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے کھولا ـــــ مس حیدری نے لکھا تھا:

"آپ اس قدر بدل گئے ہیں۔ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے ـــــ میں کئی بار آپ سے ملنے آئی لیکن آپ کی چابیوں اور کوٹ کے علاوہ اور کسی سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ یہ کوٹ اور چابیاں میری رازداں ہیں۔ کاش! آپ کو یہ وہ سب کچھ بتا سکیں جو میں انھیں بتا چکی ہوں۔

ـــــ مس حیدری"

میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

تین سال ہو گئے ہیں میں نے وہ کوٹ اور چابیاں دونوں بیوی کی تحویل میں دے

دی ہیں لیکن اس بھلی لوگ کو آج تک یقین نہیں آسکا کہ جو راز مس حیدری نے کوٹ
چا بیوں کو بتایا تھا میں اسے نہیں جانتا۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی عورت نے سارے محلّے میں مجھے 'بڈھے ٹھرکی' کا خطا
دلا دیا ہے جس نے مجھے نامرد ہونے کے الزام سے بچایا تھا ۔۔۔ لیکن یہ تو تیس سا
پہلے کی بات ہے!

بہوا

بہوا کے جانے کے تیسرے دن بھیا کی نئی نویلی دلہن بھی میکے چلی گئی۔
اب حقیقت تو خدا کو یا بہوا کو بہتر معلوم ہے لیکن اس کے اچانک چلے جانے سے ہمارے گھر میں عجب قسم کی خاموشی چھا گئی ہے۔ بھیا اپنا فٹ بھر لمبا سگار لے کر لان میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ حتّٰی کہ اُن کے منہ سے مُنّے کے متعلق بھی کوئی بات نہیں نکلتی ـــ اب آپ ہی بتائیے پہلے بھی کبھی یوں ہوا تھا؟
بہوا کے جانے سے پہلے تو بھیا چھین چھین کر مُنّے کو بہوا سے لے جاتے تھے کبھی اس کے لیے ہوائی جہاز بناتے۔ کبھی اس سے سرکس کراتے ـــ تھک کر اُن کی گود میں لیٹ جاتا تو گالیوں کی مشق کراتے لیکن اب تو وہ کرسی میں دھنسے یوں بے نیاز ہو گئے ہیں گویا مُنّا اس گھر کا نہیں، ہمسائے کا بچہ ہے جو بھول کر یہاں آ گیا ہے ـــ؟
مُنّا اُن کی کرسی سے لگ کر آہستہ سے کہتا ہے:
"جھے چاچا ـــ جھاچا چا"
لیکن مسکرا کر دیکھنے کے علاوہ اُن کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی اور میں سوچتی ہوں کہ

آخر بات کیا ہے ـــــ دلہن میکے سے آتی کیوں نہیں؟ ـــــ بھوا کو مہردین کیوں نہیں ڈھونڈ لاتا؟

بھوا تھی تو گھر آنگن سبھی سجا ہوا تھا ـــــ کانگڑے کے یہ مہاجر ہمارے گھر میں نوکر تھے۔ بھوا منّے کو کھلاتی تھی اور کپڑے وغیرہ دھوتی تھی۔ مہردین باورچی کا کام کرتا تھا اور دونوں کی خوب گزران ہوتی تھی ـــــ بھوا کی بوڑھی ساس جس کا چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا تھا سارا دن نوکروں کے کوارٹروں کے سامنے نیم کے پیڑ تلے گڑگڑی پیتی اور بھوا کے کام میں کیڑے نکالتی تھی۔

یہ بھیا کی برات سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے، بھوا پچھلے آنگن میں تار پر دُھلے ہوئے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر ڈال رہی تھی۔ میں منّے کے چھوٹے سے سرخ پاجامے میں ازار بند ڈال رہی تھی۔ ہر بار جب بھوا کپڑا نچوڑتی تو منہ کو بھی آستین سے پونچھ لیتی۔ کچھ دیر تو مجھے خیال نہ آیا۔ پھر میں اس کے قریب چلی گئی۔

بھوا رو رہی تھی۔

اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور ناک کی موٹی سی نتھلی پر ایک جھلملاتا آنسو پھسل رہا تھا۔

میں قریب پہنچی تو بھوا اور بھی تندہی سے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بھوا۔ ہُوا کیا ہے آخر؟"

"بی بی جی! اب کہو تک ان کی باتاں برداشت کروں جی؟"

"کن کی باتاں؟" میں نے پوچھا۔

"مہردین اور اس کی ماں کی ـــــ"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی ـــــ"

"اب جی مہرا کہوے جی کہ جا تک کیوں نہ ہوا ابھے تک ہاں ـــــ"

یہ کہہ کر بھوا پھپک پھپک رونے لگی۔

میں اسے اس وقت تک تسلی دیتی رہی جب تک اماں نے مجھے اندر نہ بلا لیا۔

بھوا کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے لیکن روپ وان عورت ابھی تک بچے کو ترس رہی تھی۔ منّے کو سارا دن لیے پھرتی اور میرا خیال ہے اگر میں اسے اجازت دیتی تو شاید وہ منّے کو رات بھی اپنے ساتھ ہی سُلاتی۔

کچھ تو بھوا کی بد نصیبی تھی اور کچھ مہر دین اور اس کی ماں نے اس کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ جب کبھی وہ اکیلی بیٹھی مجھے نظر آئی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو ہوتے۔

برات کی واپسی پر سب تھک ہار کر سو چکے تھے۔ صرف دوسری منزل میں دولہا دولہن کے کمرے میں بتی روشن تھی۔ مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔ خدا جانے کیوں میرا دل سرِ شام سے گھبرایا ہوا تھا۔ بھیا نے دلہن کو پہلی مرتبہ آج ہی دیکھا تھا اور دلہن کی صورت واجبی اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ بے چاری جب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی تو بھی لگتا تھا کہ جیسے مسکرائے جا رہی ہے۔ ننھا سا ایک دانت نچلے لب پر کچھ اس انداز سے ٹکا ہُوا تھا کہ اس کی ساری سنجیدگی کو چاٹے لیے جاتا تھا۔

پھر اوپر والی منزل سے کوئی بھاگ کر نیچے اترا تو میں منّے کو سوتا چھوڑ کر برآمدے کی طرف چلی۔ بھیا کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھنے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

"تم لوگوں نے میرے لیے اچھا نگینہ تلاش کیا ——"

میرا دل سینے میں زور زور سے اچھلنے لگا:

"کیوں کیا بات ہوئی ——"

"بھابی! کچھ دیکھ تو لیا ہوتا —— تمہیں اپنے دیور پہ ذرا بھی ترس نہ آیا۔"

بھیا کی آنکھوں میں کچھ ایسے آنسو تھے اور آواز میں ایسی دکھ بھری تڑپ تھی کہ

میرا اپنا جی دُکھ گیا — لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب واویلا کرنے یا گلہ کرنے سے کچھ ہاتھ نہ آ سکتا تھا۔

میں نے منت سماجت کر کے بھیا کو اوپر بھیجا اور جی ہی جی میں دعائیں مانگنے لگی کہ یا اللہ! بھیا دلہن کی طبیعت کے اسیر ہو جائیں — بھیا اور دلہن کی یوں بنے کہ سارا گھر انہ جلے — لیکن صبح کی اذان ہو گئی اور میری آنکھ نہ لگی۔

صبح گجردم جب بوا منّے کے لیے دودھ کی بوتل لائی تو اس نے جھک کر میرے کان میں کہا:

"بی بی! بھیا تو لان میں گھوم رہے ہیں — کیا دلہن من کو نہیں لگی اُن کے؟"

یہ اس روز کا ذکر ہے جب اماں نے پہلے دن دلہن کا قدم بھاری جان کر سارے میں مٹھائی بانٹی تھی — ہم سب دلہن سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور وہ پلنگ پر بیٹھی کبھی بھیا کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی اپنے پیروں کی طرف۔

پھر سرونٹس کوارٹرز کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور اماں بھاگی بھاگی ادھر کو لپکیں۔ نیم کے درخت کے نیچے مہر دین کی ماں گڑگڑی لیے بیٹھی تھی اور مہر دین کے ہاتھ میں بجھی ہوئی چھوٹی سی لکڑی تھی اور وہ بڑھ بڑھ کر بوا کو پیٹ رہا تھا۔

میں نے مہر دین کی بس ایک ہی بات سنی اور پھر وہ ہمیں دیکھ کر اپنے کمرے میں جا چھپا وہ کہہ رہا تھا:

"دیکھتی نہیں۔ دو مہینے آئے کو نہیں ہوئے اور دلہن امید سے بھی ہو گئی۔ تجھ ایسی کوکھ جلی سے میں کب تک نباہ کروں گا — جا یہاں سے جا —"

اسی رات خدا جانے بوا کہاں چلی گئی؟

پولیس میں رپٹ لکھوائی۔ مہر دین کے تمام رشتے داروں میں تلاش کیا لیکن

بھوا کا سراغ نہ ملا۔

اور پھر بھوا کے جانے کے تیسرے دن اچانک دلہن بیگم نے ٹانگہ منگوایا اور اپنے میکے رخصت ہو گئیں۔

میں نے بھیا سے پوچھا تو وہ بولے:

"تم نے بھوا کو دیکھا تھا؟ — اتنی خوبصورت عورت مہر دین جیسا نکال سکتا ہے تو میں ہی ایسا پاگل رہ گیا ہوں کہ تمہاری دلہن کے ساتھ گزارہ کرتا رہتا۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا: "بھیا دیکھتے نہیں اللہ نے دلہن پر کیسی رحمت کی ہے۔"

بھیا چبا چبا کر بولے:

"جی ہاں — ایک ان ہی کو اس رحمت کی ضرورت رہ گئی تھی؟ — پہلے جو ماشاءاللہ بہت خوبصورت تھیں اب اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔"

"بھیا یہ کفرانِ نعمت ہے۔ توبہ توبہ ڈرو اس کے قہر سے۔"

"قہر تو جی اس کا مجھ پر نازل ہوا ہی ہے — پہلے کم از کم اپنے جامے میں تو رہتی تھی — اب تو وہ بھی اترانے لگی تھیں — ایک اتراتی ہوئی بدصورت عورت تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"بھیا —!" میں نے چلا کر کہا۔

"پہلے اس کی چاکری ہی کیا کم تھی جو اب اس کے بچوں کو بھی پالتا پھروں — ٹھیک ہے اُسے وہیں رہنے دو جی —!"

میں خاموش ہو گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے بھوا اور دلہن دونوں ہاتھ پکڑے اور واپس نہ آنے کی قسم کھا کر دھرتی تلے اُتر گئی ہوں!

پہلا پتھر

زارا کی نگاہیں ٹیلی فون پہ جمی تھیں لیکن وہ بڑی تیزی سے عصمت سے باتیں کیے جا رہی تھی:

"دیکھو عصمت! بس زندگی میں غیرت ہی ایک چیز ہوتی ہے۔ اگر ہمیشہ تم ہی اس سے ملنے جاؤ گی تو وہ تمہیں اپنی جوتی برابر بھی اہمیت نہیں دے گا۔"

"لیکن میں کب کہتی ہوں کہ وہ مجھے اہمیت دیتا ہے!" عصمت نے کیچوے کی طرح بل کھا کر کہا۔

زارا کی نگاہیں پھر ٹیلی فون کا طواف کر گئیں اور اس نے کنفیوشس کی عظمت کو بنیاد بنا کر مشورہ دیا:

"اپنا دل ٹٹول لو عصمت! ایک طرف عاقل بھائی ہیں۔ جانتی ہو ان سے اچھا شوہر والدین تلاش کر کے بہم نہیں پہنچا سکتے۔"

"لیکن میرا دل! میرا دل کوئی چیز نہیں؟"

زارا کو لگا فون کی گھنٹی اندر ہی اندر بج رہی ہے اور پھر اس کی آواز کہیں دب کر رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ سوات کا لکیر دار سرخ پردہ اس کے سر سے بڑے زور سے

ٹکرایا اور پھر ڈنڈے سمیت مخملیں دیوان پر آ گرا۔ اتنی سنجیدہ گفتگو میں کامیڈی پیدا ہو گئی۔ زارا نے ہنس کر کہا:

"تمہارا دل اسی پرندے کی طرح بلندیوں سے گرے گا۔ دیکھ لینا"۔

"پھر اگر گرتا ہے تو گرنے دو۔ شاید پھر اسے عقل آ جائے گی"۔

عصمت نے اپنی کتابیں اٹھائیں، سر پر بددلی سے دوپٹہ اوڑھا، پاؤں میں سلیپر ٹھنسائے اور بغیر مطلع کیے برآمدے تک پہنچ گئی۔ زارا نے فون کی طرف دیکھا کمبخت اس کی گھنٹی شاید خراب تھی۔

پھر وہ بھی دروازہ کھول کر عصمت کے پیچھے برآمدے میں چلی گئی لیکن عصمت بھاری قدم دھرتی پھاٹک تک نکل گئی تھی۔ زارا نے ہاتھ ہلایا۔ عصمت نے جواب میں کتابوں والا ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔ بچے ابھی تک سکول سے نہیں آئے تھے۔

گھر میں کتنی خاموشی تھی۔ زارا ستون کے ساتھ کمر لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اوپر ستون اور چھت کے درمیان چھوٹے سے موکھے میں چڑیا اور چڑا گھر بنانے کے مشورے کر رہے تھے۔ دو تنکے ساتھ تھے جنہیں وہ اس چھوٹی سی جگہ میں جماتے، ادھیڑتے اور پھر جماتے تھے۔ چڑے میاں کا مزاج ذرا تند تھا وہ چڑیا کی ہر ہر سکیم فیل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس پر اگر ذرا سا چڑیا بھی خم کھاتی تو دو تین چونچیں دھاتس دیتے۔

زارا بڑی دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

فون کی گھنٹی میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔

اس نے اپنے جی میں کوئی ہزارویں مرتبہ کہا۔ "ہونہہ۔ نہیں کرتا فون تو نہ سہی میں کوئی عصمت ہوں"۔

لیکن گھر کتنا خاموش تھا۔ اماں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں اور جی میں اس اودبلاؤ کی سی کھدبد ہو رہی تھی جسے پانی کی تہ سے پلیسہ نکالنے سے روک رکھا ہو۔ ابا تو خیر کبھی تین بجے

آتے ہی نہیں لیکن اماں کیوں غائب ہیں بھلا؟ کالج سے گھر واپس آؤ اور اماں نہ ملیں تو دل ویران ہو جاتا ہے۔

زارا نے اپنے وجود کو دیوان پر ڈال دیا اور سوچنے لگی ہفتہ کی رات کے متعلق ــــ ہفتہ کی رات ویسے بھی اپنے اندر ایک رومان کی دنیا رکھتی ہے لیکن اس ہفتہ کا خواب اس کے ساتھ ابھی تک چل رہا تھا۔

"یہ ہیں فلائٹ لیفٹیننٹ زبیر احمد"۔

"اور یہ ہے زارا ــــ روس کی نہیں اپنے پاکستان کی"۔

زبیر احمد نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔ بس لمحہ بھر کے لیے اور پھر وہی امریکن رسالہ دیکھنے لگا جس کے باہر کسی نیم برہنہ عورت کی تصویر تھی۔

"بھائی زبیر! ہم اسے بینا لولو برجیڈا کہتے ہیں"۔

"ہیں ــــ!" زبیر نے ایک نظر اسے سر سے پیر تک دیکھا ــــ توبہ! کوئی جون کی دھوپ میں کھڑا رہ سکتا ہے بھلا؟ زارا خاموشی سے ریڈیو گرام کی طرف پلٹ گئی۔

زبیر ساری شام وہی امریکن رسالہ پڑھتا رہا اور سعیدہ اپنے بھائی کی تعریفیں کرتی رہی۔ زارا ان تعریفوں سے چڑ گئی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ امریکن رسالے کے پیچھے سے کبھی کبھی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ابھرتی ہیں اور اس کا طواف کر کے لوٹ جاتی ہیں۔ گپ چپ آہستہ آہستہ:

جب وہ کھانے کے بعد اپنے گھر جانے والے تھے اور اماں، زرّیں، شبانہ اور جاوید کار میں چڑھ گئے تھے تو وہ اپنا پرس لینے دوبارہ اندر آئی تھی یا خدا جانے پرس نہیں وہ کسی اور کی تلاش میں آ نکلی تھی۔ زبیر اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں اس کا پرس ریکارڈوں کے قریب دھرا تھا۔ پرس کے ساتھ بندھی ہوئی لمبی زنجیر اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے کھولنے ہی والا تھا جب زارا اندر پہنچی ــــ بغیر آستینوں کی قمیص پہنے، لمبی ایڑی پر وزن جمائے، اس نے

سب سے پہلے اپنا عکس شیشے میں دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نظر زبیر احمد پر پڑی۔ وہ یقیناً ہر طرح سے اس سے گھٹیا تھا۔

"میرا پرس!" نارا نے آہستہ سے کہا۔

زبیر نے پرس اپنی پشت کی جانب کر لیا۔ پتلی پتلی راجپوتی مونچھوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"میرا پرس دے دیجیے پلیز"۔

"تاوان ادا کیجیے بھول جانے کا"۔

باہر ابا نے ہارن بجایا۔ نئی گاڑی کا نیا ہارن۔

"دے دیجیے پلیز ـــــ ابا بُلا رہے ہیں"۔

"لے لیجیے اگر طاقت ہے ورنہ ہم تو ہر ایک چیز کو ہوا میں اچھال دینے کے عادی ہیں"۔

"پلیز ـــــ!"

زبیر نے نگاہیں فرش پر جما کر کہا۔ "اب یہ کیسے ثابت ہو کہ یہ پرس آپ کا ہے!"

باہر پھر ہارن بجا ـــــ تلخی کے ساتھ۔ بڑی طوالت سے۔

"دیکھیے نا ـــــ"

"فون کیجیے گا نا ـــــ؟"

"آپ کر لیجیے گا خود ہی ـــــ" نارا نے پرس کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"نہیں بیٹی۔ تاوان تو آپ کو ادا کرنا ہے"۔

ہارن اس بار بجتا ہی گیا۔

"اچھا لے لیجیے ـــــ لیکن فون کیجیے گا"۔

"اگر آپ کر دیں گے تو میں جواب دے دوں گی"۔

پرس لے کر وہ پچھلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ زرین نے اس سے کچھ پوچھا۔ شبانہ نے چڑ کر کچھ کہا لیکن وہ کھڑکی سے پرے دیکھتی رہی۔ درختوں سے گھری سایہ دار سڑک اسے آج نئی سی لگی۔ کار کے شیشے پر راجپوتی مونچھوں کا عکس خدا جانے اسے کیوں نظر آتا رہا۔

پورے تین دن جا چکے تھے اور سعیدہ کے گھر سے ایک بار بھی فون نہ آیا تھا۔ ہر بار جب فون کی گھنٹی بجتی تو وہ ہر کام چھوڑ کر اسے اٹھانے جاتی۔ آخری بار جب ابا کے دفتر سے ان کے چپراسی نے فون کیا تو اس نے بغیر سلام کا جواب دیے ہی چونگا ٹیک دیا اور خود بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

عصمت جا چکی تھی۔ یہاں کا بہانہ بنا کر وہ سیدھی ریلوے سٹیشن جائے گی اپنے مختار سے ملنے ـــــ ریلوے سٹیشن ملاقات کی اچھی جگہ ہے۔ انگریزی گانے کی طرح ڈکارتی ٹرینیں واں واں کرتی پلیٹ فارموں پر آتی ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور اس بھیڑ میں عصمت پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدے کالج کی کتابیں ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ ابھی پرسوں تو وہ کہہ رہی تھی کہ اتوار کے دن جو چیکر اب صبح کے وقت ہوتا ہے وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا ہے اور اسی لیے اب اتوار کے دن وہ صبح کو ریلوے سٹیشن نہیں جاتی۔

شاید فون کی گھنٹی بجی؟

اس نے اپنی لمبی ٹانگیں سمیٹ لیں اور اس کا رواں رواں گھنٹی کے ارتعاش پہ لرزنے لگا۔ جس طرح کبھی آسمان پر شور مچاتا ہوائی جہاز گزرتا ہے تو مکانوں کی کھڑکیوں میں شیشے جلترنگ سا بجانے لگتے ہیں لیکن دوسرے لمحے زارا اوندھی لیٹ گئی۔ فون کی گھنٹی نہ تھی اندر کھانے کے کمرے میں ٹائم پیس غلط الارم بجا رہا تھا۔ گھر کتنا سنسان تھا۔ وہ اٹھ کر فون کے قریب سرخ بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں عصمت گھوم رہی تھی۔

عصمت کی دیدہ دلیری بھی خوب ہے۔ کیسے پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر وہ سیڑھیاں

چڑھتی ہے اور پھر پُل پر اس وقت تک کھڑی رہتی ہے جب تک نیچے سے مختار برآمد نہیں ہوتا۔ کئی بار تو اسے پون گھنٹہ تک راہ دیکھنا پڑتی ہے۔ ٹرینوں میں سے ایک خلقت نکلتی ہے لیکن اس ہجوم میں مختار نہیں ہوتا۔ پھر گھر لوٹنے کی بھی جلدی ہوتی ہے ـــــ لیکن ایک منٹ کرتے کرتے وہ پون گھنٹہ کھڑی رہتی ہے اور پاؤں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں گاڑیوں کے دھوئیں سے جی مالش کرنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کسی انجن تلے کود کر جان دے دی جائے۔

لیکن ہمیشہ ایسے لمحوں میں کہیں سے مختار آجاتا ہے اور پھر وہ دونوں رش سے ہٹ کر ایک معمولی سے بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ریل کی متوازی پٹڑیوں کی طرح باتیں بھی لامتناہی ہوتی ہیں ـــــ اور ہر بار ملنے کے باوجود نقطۂ اتصال پیدا نہیں ہوتا۔

گھر میں کتنی خاموشی تھی۔

باہر چڑیا اور چڑے کی جوڑی چونچوں میں پھونس اٹھائے ستون کے موکھے میں گھر بنانے کے جتن کر رہے تھے۔ باورچی خانے میں نلکے کے پانی کا دھارا پوری آب و تاب سے بہہ رہا تھا اور ڈائننگ ہال سے برتن اٹھانے اور لگانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ زارا نے ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھ دیں اور آخری بار سوچا:

"اور اگر میں زبیر کو فون کروں تو؟"

یہ خیال اس کے ذہن میں چکر لگاتا چمگادڑ کی طرح لٹک کر رہ گیا۔

اس نے فون کے چونگے پر ہاتھ دھرا اور پھر اٹھا لیا۔ اسے یوں لگا کہیں سے عصمت نے دیکھ لیا ہے اور وہ پلیٹ فارم کے اوپر سے رومال ہلا کر کہہ رہی ہے:

"زارا! بسٹ آف لک ـــ لیکن ـــ دیکھنا یہ خارزار ہے۔ یہاں پتہ مارنا پڑتا ہے پتہ!"

چونگا اٹھانے اور رکھنے میں ابھی جانے کتنی دیر لگ جاتی اگر اسے خیال نہ آتا کہ ابھی